

ایمان اور رضا

— عبد الحمید صدیقی —

رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ

عالم مادی میں اللہ تعالیٰ نے جس طرح کھجور اور پیاس کو مٹانے کے لیے اکل و شرب کا انتظام فرمایا ہے اُسی طرح روحانی احساسات کی تسکین کے لیے رضا اور ایقان کے حصول کا طریقہ بتایا ہے۔ اپنی ذات اور اپنے رب سے راضی انسان ہی اپنے ماضی و حال سے مطمئن اور مسرور ہوتا ہے اور اللہ کے عدل و انصاف اور آخرت کی جزا و نزا کا یقین ہی اسے درخشاں مستقبل کا اطمینان دلاتا ہے اور نتیجہ حقیقی سکون عطا کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایمان و ایقان سے محروم لوگ کبھی بھی حقیقی شادمانی حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کی زندگی تلخ اور تاریک ہوتی ہے۔ وہ مسلسل غم، پیچیدگی، مصیبت اور ہمیشہ تنگدلی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اپنے آپ سے نیراز اپنے ابنائے نوع سے ناراض اور دنیا کی ہر چیز کے خلاف نفرت کے جذبات پال کر وہ اس عالم فراح کو اپنے لیے سوتی کے نمک کی طرح تنگ اور محسوس کر لیتے ہیں جس میں جینا ایک عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بندہ مومن بھی کبھی غم و حزن کا شکار ہو جاتا ہے لیکن اول تو اسے غم جاں نہیں غم جاں ہوتا ہے، غم دنیا نہیں غم آخرت ہوتا ہے اور کبھی غم جاں اُسے دامنگیر بھی ہو تو اُس کا اثر بالکل عارضی ہوتا ہے، اس لکڑی کی مانند جو وسعتِ افلاک میں نمودار ہوا اور ایمان کی بادِ تند و تیز اُسے اُڑا لے جائے۔

حقیقتِ رضا کا شعور ان اسباب میں سے ایک ہے جو انسان کو ابدی سعادت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

« من سعادۃ المؤمن استخارۃ ربہ ورضاہ » اپنے رب سے استخارہ و طلبِ خیر کرنے اور اُس کے

بما قضی، ومن شقاء المرء توکمه الا استخار
وعدم رضا، بعد القضا۔

دسمند احمد ترمذی - بخاری

فیصلہ پر راضی ہو جانے والا انسان بڑا سعادت مند ہے۔
اور بڑا بد بخت ہے وہ شخص جو خدا سے نہ بھلائی کا طلب کرے
اور نہ اس کے فیصلہ پر راضی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ مومن ہر کام میں ہاتھ ڈالنے سے قبل اللہ تعالیٰ سے بھلائی کا طلب گار ہوتا ہے۔ وہ دعا کرتا ہے:
اللهم ان کنت تعلم ان هذا الامر خیر
لی فی دینی ومعاشی وعاقبة اموی فیسره
لی وبارک لی فیہ، وان کنت تعلم ان هذا
الامر شری فی دینی ومعاشی وعاقبة اموی
فاصرفه عنی واصرفنی عنه واقدر لی الخیر حیث
کان ثم رضنی بہ۔

اے اللہ اگر تو اس کام کو میرے دین و دنیا کے لیے اور
انجام کار کے طور پر میرے لیے بہتر سمجھتا ہے تو اسے مجھ پر
آسان کر دے اور اس میں مجھے برکت دے۔ اور اگر تو اس
کام کو لمبا و دین و دنیا اور لمبا و انجام میرے لیے بُرا خیال
فرماتا ہے تو اسے میری نظروں سے ہٹا دے اور مجھے اس
کام سے باز رکھ۔ اور میرے لیے خیر کو مقدر فرما جہاں بھی ہو
اور اس خیر مقدر کے ساتھ مجھے راضی کر دے۔

چنانچہ مومن اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر پورا خواہ وہ اچھی ہو یا بُری — ہر حال میں راضی رہتا ہے۔ اور صبر و رضا کی
یہ صفت اُس کے دل کو کشادہ اور سینے کو فراخ کر دیتی ہے۔ وہ نہ کبھی غموم ہوتا ہے نہ تنگدل نہ اُسے اپنے آپ غصہ
آتا ہے نہ اس کا ناسات پر نہ زندگی پر اور نہ زندگی سے پہرہ و مغلقات پر۔ اس کے برعکس وہ اپنی ذات، اپنے گرد و
پیش اور جملہ موجودات سے راضی اور خوش رہتا ہے کیوں کہ مسرت و رضا کا سرچشمہ اُس کے ہاتھ لگ چکا ہوتا ہے اور
وہ ہے اللہ رب العالمین پر غیر متزلزل ایمان۔

رضا ایک بہت بڑی روحانی نعمت ہے جس سے اللہ کے منکر یا اُس کی ہستی اور اس کی جزا و جزا میں شک کرنے والے
محروم ہیں۔ اس نعمت کو وہی حاصل کر سکتا ہے جس کا اللہ پر ایمان مضبوط ہو۔ اللہ تعالیٰ نے رسول پاک کو صبر و استقامت
کے ساتھ اپنی حمد و ثنا اور بندگی و عبادت کرتے رہنے کی تلقین کی اور فرمایا لَعَلَّكَ تَوْضِي (یعنی اس عمل ایمانی کے نتیجے میں،
ہو سکتا ہے کہ آپ نعمت رضا کو پالیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

ذاق طعم الايمان من رضى بالله رباً
وبالاسلام ديناً ومحمد رسولاً۔

جو شخص اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے
پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر راضی ہو
گیا اُس نے حلاوتِ ایمان کو چھچھ لیا۔

رواہ احمد، مسلم و الترمذی

قرآن پاک میں صحابہ کرام کی سبقتِ ایمانی اور صداقتِ ایمانی کی شہادت دینے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ وَرَضُوا عَنْہُ کا عظیم اعزاز عطا فرمایا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مقامِ رضا پر فائز ہونے کے لیے دولتِ ایمان ناگزیر ہے۔

۱۔ مومن اپنی ذات اور اپنے رب سے راضی ہوتا ہے | اپنی ذات سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے وجود اور شخصیت اور کائنات میں اپنے مرتبہ و مقام سے راضی ہے، کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ وہ کوئی مہمل ہستی یا ناقص و حقیر چیز نہیں بلکہ خالق کائنات کی صفتِ صنعتِ گری کا شاہکار ہونے کی وجہ سے ایسی با شرف مخلوق ہے جو زمین پر خدا کی خلافت کے منصبِ جلیل پر فائز ہے۔

علاوہ ازیں مومن پھر سے بھی راضی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کی صفاتِ کمال و جمال پر ایمانِ کامل اور اس کے عدل اور رحم کا یقین محکم رکھتا ہے۔ اور اس کے علم و حکمت کی طرف سے بھی پوری طرح مطمئن ہوتا ہے نیز وہ سمجھتا ہے کہ اللہ کا بے پایاں فضل اور اُس کے بے شمار احسانات اُس پر ہیں۔ بقول سیدنا ابراہیم علیہ السلام:-

اللّٰہِیْ خَلَقَنِیْ مُؤَبِّدِیْنَ ۝ وَالَّذِیْ ہُوَ
یُطْعِمُنِیْ وَیُصْفِیْ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَہُوَ شَافِیْ
وَالَّذِیْ یُبْرِیْیْ نِیَّتِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ اَطْعَمَ
اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْئَتِیْ یَوْمَ الْمَدِیْنِ ۝
(الشعراء: ۷۷: ۸۲)

میرا رب وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے، جو مجھے موت دیگا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا۔ اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ جزا کے دن وہ میری خطا معاف فرما دیگا۔

غرض مومن اپنے حق میں اللہ کی تدبیر کو اپنی تدبیر سے بہت بہتر قرار دیتا ہے۔ وہ اس کے ہر کام کو سرسمر رحمت اور سراپا خیر سمجھتا ہے۔ اور اگر اُسے خدا کی خدائی میں کہیں کوئی کمی نظر آئے تو اسے بھی وہ کمی پر محمول نہیں کرتا بلکہ تکمیلِ خیر کا سامان یا اثباتِ خیر کے لیے شرطِ لازم گردانتا ہے۔ مصیبت و تکلیف بلاشبہ شر ہے لیکن اس کے بغیر صبر کا دامن خیر بھی تو ہاتھ نہیں آ سکتا۔ اسی طرح فقر و افلاس میں اگر ایک صورتِ شر موجود ہے تو اتفاق فی سبیل اللہ اور سخاوت و کرم جیسی خیرات و حسنات کے اطمینانات بھی اسی کے وجود سے نمایاں ہوتے ہیں لہذا اپنی ذات اور اپنے رب کی صفات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو ایک منبذہ مومن کو ناراض کرنے والی ہو۔

۲۔ مومن حیات و کائنات سے بھی راضی ہوتا ہے | مومن یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ عالمِ موجودات اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ اور اس کا ذرہ ذرہ اللہ کی بے مثال حکمت و دانائی پر دلالت کرتا ہے۔ اُس کے ہمہ گیر رحم و کرم کا

منظہر ہے اور اُس کے لامحدود علم و قدرت کا شاہکار ہے۔ اُسے اس عظیم کائنات کی تدبیر و انتظام میں کہیں کوئی خرابی اور خلل نظر نہیں آتا۔ وہ انسانوں اور دوسری مخلوقات کو دیکھتا ہے تو اُن کے رزق کی تقسیم، اُن کا غم و انبساط، اُن کی عاجزی و درماندگی اور اُن کی قدرت و توانائی۔ کسی چیز میں بھی اُسے کہیں عدل سے انحراف اور ظلم کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ حق اور سراسر حق ہی مشاہدے میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حیات و موجودات کے اس مہرِ حکمت، متوازن اور مبنی بر عدل نظام سے ایک ایماندار کو راضی ہونا ہی چاہیے۔

۳۔ مومن انعاماتِ خداوندی کا گہرا احساس رکھتا ہے | اپنے آپ سے بیزار رہنے اور زندگی کا گلہ شکوہ کرنے والے لوگ بالعموم وہ ہوتے ہیں جو موجود انعاماتِ الہی کا احساس نہیں رکھتے۔ وہ یہ تو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فلاں شے نہیں۔ ہمیں وہ اور وہ چیز چاہیے لیکن انہیں اظہارِ شکوے کی کبھی نہیں سنا گیا کہ یہ اور یہ نعمتیں ہمیں حاصل ہیں۔ اس کے برعکس مومن اللہ کے عظیم احسانات کے احساس سے ہر وقت سرشار رہتا ہے۔ وہ اس بات کا گہرا شعور رکھتا ہے کہ اللہ نے اسے نسلِ انسانی کے ایک فرد کی حیثیت سے تخلیق کیا، علم و ادراک اور غور و فکر کی صلاحیتیں عطا کیں، نطق و بیان اور سماعت و بصارت سے نوازا، اُسے دست و پا دیئے اور اُن میں فعل و عمل کی قوت و استعداد پیدا کی۔ اس کے پہلو میں دل پرست کیا اور اُسے اخوت و محبت، رحم و شفقت اور اثبات و قربانی کے جذبات سے معمور کیا۔ اس کے تن و شکم کی ضروریات کے لیے زمین نے رزق کے خزانے اُگلے اور آسمان سے وحی الہی کے ذریعے اس کی فطری امنگوں اور روحانی تقاضوں کو پورا کیا گیا۔ وہ جب غور کرتا ہے تو اپنی ذات میں بے شمار انعامات موجود پاتا ہے۔ حتیٰ کہ انفس و آفاق اُسے جلی و خفی نعمتوں سے مملو نظر آتے ہیں جن سے وہ براہِ راست یا بالواسطہ استمتاع کر رہا ہوتا ہے۔ **وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصَوْهَا۔** یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو انعام الہی کا سب سے زیادہ شعور رکھتے تھے اُٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرتے رہتے اور جذباتِ تشکر و سپاس کا اظہار کرنے نہ ٹھکتے۔ مقصود یہ تعلیم دینا تھا کہ بندوں پر رحمتِ حق کی فراوانی صرف اس بات کا ہی تقاضا نہیں کرتی کہ وہ اُس کا کبھی شکوہ نہ کریں اور ہمیشہ راضی رہیں بلکہ اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ وہ رب العزت کی تحمید و توصیف میں ہر آن طرب اہسان رہیں۔

۴۔ مومن اللہ کی تقدیر پر راضی ہوتا ہے | مومن جو اپنے آپ کو ہر وقت انعاماتِ الہی کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس کرتا ہے اللہ کی مشیت اور تقدیر — خواہ وہ اچھی ہو یا بُری — پر بھی راضی رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام عبث، لایعنی اور خلاصِ حکمت نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ

خواہ مخواہ اپنے بندوں کو مصیبت میں مبتلا بھی نہیں کرتا۔ ایک مومن صادق کی نظر میں رب العزت اپنے بندوں کے لیے والدین سے بھی زیادہ رحیم و شفیع ہوتا ہے۔ اُس کی رحمت اُس کے قہر و غضب اُس کے مواخذہ و احتساب بلکہ ہر چیز پر حاوی ہے۔ پھر کسی طرح ممکن ہے کہ وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی کے ساتھ ظلم کا ارتکاب کرے؟ اُس کا کوئی فیصلہ بظاہر ظلم بھی نظر آتے تو مومن اُسے بھی خیر اور رحمت ہی پر محمول کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَعَسَىٰ اَنْ تَكُوْنُوْا شٰیْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَبْرًا کَثِیْرًا (النساء: ۱۹) تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اُسی میں تمہارے لیے خیر کثیر رکھ دے۔ اہل ایمان کا یہی وہ غفیدہ رضا بقضاء ہے جس کے خوشگوار اثرات کو مسلم معاشرہ میں رہنے والے بہت سے اہل مغرب نے بھی محسوس کیا ہے۔ انہی میں سے ایک مغربی اہل قلم ف۔ س بوڈلے "میں نے اللہ کی جنت میں زندگی بسر کی" کے زیر عنوان لکھتا ہے۔

"۱۹۷۸ء میں میں اپنے ماحول کو چھوڑ کر شمال مغربی افریقہ چلا گیا۔ وہاں میں نے بدوؤں کے درمیان صحرا میں سات برس گزارے۔ میں اُن کی زبان سیکھتا، انہی جیسا لباس زیب تن کرتا، اُن کے ساتھ کھاتا پیتا اور اُن کے سب سے ہی معمولات زندگی اختیار کرنا تھا۔ اس عرصے میں میں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک کتاب تالیف کی جس کا نام الرسول ہے۔ وہ سال جو میں نے اُن خانہ بدوش عربوں میں بسر کیے میری زندگی کے بہترین سال تھے اور امن و سکون اور لذتِ حیات سے بھرپور بھی۔ میں نے اُن صحرائیوں میں رہ کر محسوس کیا کہ یہ لوگ اتہائی قلوب و اضطراب کے عالم میں بھی پرسکون رہتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات کا مضبوط اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ مقدر ہے ہو کر رہے گا، اُسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور کسی شخص کو وہی دکھ پہنچتا ہے جو اس کے لیے لکھ دیا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ نزولِ بلا کے وقت ایک دوسرے پر ترمیم کر کے بیٹھ رہتے ہیں اور ہاتھ پاؤں باندھ کر مصیبت پر مصیبت بہتے چلے جاتے ہیں۔ یہیں ہرگز نہیں۔ ایک واقعہ سنئے:

ایک دن ٹھسا دینے والی تیز ہوا چلی۔ وہ اتنی شدید تھی کہ صحرا کی بے شمار ریت اٹھاتے ہوئے بحرِ مہین متوسط عبور کر گئی اور اسے فرانس کی وادیِ الرون میں جا پھینکا۔ سخت گرمی کی وجہ سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سر کے بال جڑوں سے اکھاڑے جا رہے ہوں۔ غرضیکہ یہ مصیبت میرے لیے اتنی ناقابل برداشت تھی کہ میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔ لیکن عربوں کی زبان پر ایک حرف شکایت تک نہ آیا۔ زیادہ سے زیادہ

انہوں نے جو کچھ کہا وہ تھا ”قضاء مکتوب“ یعنی طے شدہ فیصلہ۔ وہ ایسے مواقع پر زیادہ سرگرمی سے کام کرتے۔ چنانچہ انہوں نے ٹہلک ٹوچنے سے پہلے ہی اپنی بھیر بکریوں کے بچے ذبح کر دیتے۔ پھر ڈھور ڈنگرے کر جنوب کی طرف پانی کے کنارے چلے گئے۔ اور کوچ کا یہ انتہائی تکلیف دہ کام انہوں نے کمال صبر و سکون اور خاموشی کے ساتھ انجام دیا۔ اُن کے قبیلے کے سردار نے کہا تو یہ کہ ”ہمارا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوتا۔ ہم تو سب کچھ کھو کر بھی صبر کرنے کے عادی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب کے ہمارے مویشی تقریباً چالیس فی صد زندہ بچ رہے ہیں انہی سے ہم نئے سرے سے کام کا آغاز کر سکتے ہیں“

۵۔ مومن اللہ کے عطا کردہ رزق پر راضی ہوتا ہے | مومن اللہ کی تقسیم رزق اور اُس کے مواہب و عطایا پر خواہ قلیل ہوں یا کثیر۔ راضی رہتا ہے۔ اس لیے کہ اولاً وہ اپنے پاس موجود ہر نعمت کو سراسر اللہ کی رحمت اور اس کا فضل تصور کرتا ہے۔ ثانیاً اللہ تعالیٰ کو عادل اور حکیم سمجھتا ہے۔ ان بنیادی حقائق کو ذہن نشین کرنے کے بعد اُسے مال و دولت دنیا کے بارے میں اللہ سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ رزق حلال کے لیے پوری کوشش کرتا ہے اور اس کوشش کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو اُس پر قانع ہو جاتا ہے۔ اور اپنے سے زیادہ آسودہ و خوشحال لوگوں کی حالت پر جلتا نہیں بلکہ اپنے تاریخِ محنت کو صبر و شکر کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ یہی مفہوم ہے قناعت کا۔ لیکن بعض لوگوں نے تو لفظ قناعت پر ظلم ہی کر دیا۔ اُن کے خیال میں آدمی کمزوری و دہل ہمتی کی زندگی بسر کرے، ترقی و سر بلندی کی خواہش کو یکسر پامال کر کے رکھ دے اور بھوک، افلاس اور محرومی ہی کو پسند کرنے لگے تو پھر وہ رضا و قناعت کی صفت سے متصف ہوتا ہے۔ حالانکہ نہ رضا کا یہ مقصود ہے اور نہ قناعت ہی کی یہ صحیح تعبیر ہے۔

اس سلسلہ میں دو باتوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کے دل میں محبتِ دنیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اور وہ مال و دولت کی شدید حرص رکھتا ہے۔ حدیثِ نبوی ہے :

لو کان لابنِ آدم وادیان من ذهبٍ، اگر ابنِ آدم کو سونے سے معمور دو وادیاں بھی مل جائیں
لا تبغی ثالثاً، ولا یملأ عین ابنِ آدم الا تو (اس کی حرص ختم نہیں ہوگی بلکہ) وہ ایسی ہی کتنی میری
الغراب۔ وادی کی تلاش میں رہے گا۔ اُس کی آنکھ کو تو درقبر کی مٹی
ہی بھر سکتی ہے۔

انسان کی اس انتہا پسند فطرت کو معتدل اور متوازن بنانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ تعلیماتِ اسلام نے اس فرض کو

بحسن و خوبی انجام دیا اور ہوس کی آگ کو بہت کچھ ٹھنڈا کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يا ايها الناس اتقوا الله واجملوا في الطلب، فان نفساً لن تموت حتى تستوفي رزقها، وان ابطأ عنها، فاتقوا الله واجملوا في الطلب، خذوا ما حل، دعوا ما حرم (ابن ماجہ)

اے لوگو! اللہ سے ڈرو اور مال و دولت دنیا کی تحصیل میں حسن طلب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو (تمہیں معلوم ہونا چاہیے) کہ کسی شخص کو اس وقت تک موت نہیں آتی جب تک وہ اپنے حصہ کا رزق پورا پورا حاصل نہ کرے۔ اگر طے شد رزق کے حصول میں تاخیر ہو رہی ہو تو اپنے اندر خوف خدا پیدا کرو

اور حسن طلب سے کام لو جو کچھ حلال ملے اُسے لے لو اور حرام سامنے آئے تو اُسے چھوڑ دو۔

ایک اور مقام پر فرمایا: "ليس الغنى عن كثرة العوض النما الغنى غنى النفس" (متفق علیہ) غنا مال و اسباب کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ یہ دل کی تو نگری کا نام ہے۔ پس قناعت جو مطلوب اور محمود ہے یہ ہے کہ آدمی رزقِ حلال کے لیے سعی کرے اور جو کچھ پاکیزہ و طیب ملے اسے صبر و شکر قبول کرے۔ البتہ حرام سے پرہیز کرے چاہے وہ کتنا ہی ارزاں اور فراوان کیوں نہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ مؤخر الذکر ارشادِ رسول اور بہت سی دیگر نصوصِ قرآن و سنت ایک اور چیز کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ خوب سے خوب تر اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی خواہش کا رُخ دنیا کی ناپائدار چیزوں سے ہٹا کر عقبیٰ کی لائے نوال نعمتوں کی طرف پھیرنا چاہیے۔ نفس کی بُری اور ناپسندیدہ عادات کو تقویت دینے کے بجائے بندہ مومن کے لیے ضروری ہے کہ ایثار و قربانی اور بذل و انفاق جیسی ارفع و اعلیٰ صفات کو اپنے اندر پیدا کرے۔ قناعت کا یہ پہلا مفہوم ہے۔ دوسری بات جسے قناعت کے ضمن میں سمجھنے کی ضرورت ہے یہ ہے کہ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بعض لوگوں کو تو بغیر کسی کوشش کے مل جاتی ہیں مگر بعض دوسرے حضرات کو نہیں ملتیں اور وہ کوشش بھی کریں تو نہیں مل سکتیں مثلاً خوبصورت اور نوجوان ہونا۔ بلند قامت اور صحت مند ہونا، بے غم ہونا یا کثیر الاولاد ہونا۔ اب اگر کوئی بد صورت یہ کوشش کرے کہ وہ حسن و جمال کا پیکر بن جائے تو یہ ناممکن ہے۔ کوئی پیر فرزند عہد شباب کو ٹوٹانا چاہے تو ظاہر بات ہے اسے ناکامی ہوگی۔ کسی کو تاہ قد کا یہ ارمان کہ وہ بلند قامت ہو جائے کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح بے درپے غموں اور صدموں سے نڈھال انسان شہاش بشاں رہنا چاہے یا کوئی ثمر زندگی سے محروم، عمر کے آخری حصے میں فرزند ارجمند کا منہ دیکھنا چاہے تو شاید ان حضرات کی آرزوئیں بھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ ایسے لوگوں کو ایمان باللہ تبتا ہے کہ غنا و سعادت اس چیز کا نام نہیں کہ آدمی اپنی

جملہ خواہشات کی تکمیل میں کامیاب رہے بلکہ غنا و سعادت کا راز خدا کی تقسیم اور تقدیر پر راضی رہنے میں مضمر ہے۔ ارشادِ رسولؐ ہے اَرْضِ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ اَغْنٰی النَّاسَ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تیری قسمت میں لکھا ہے اس پر راضی ہو جا، تو تمام لوگوں سے زیادہ غنی ہو جائے گا۔ مَا قُلَّ وَ كَفٰی خَيْرٌ مِّمَّا كَثُرَ وَالْهٰی قَبِل اور کفایت کرنے والی نعمتیں بہت بہتر ہیں کثیر مگر غافل کر دینے والے انعامات سے۔ دین کی ان تعلیمات کی بدولت محروم لوگ اپنی تلخ اور ناگوار زندگی کو بھی گوارا بنا لیتے ہیں اور پھر اُن کا نفس کبھی ناممکنات اور محالات کی طلب کے درپے نہیں رہتا۔ یہ قناعت کا دوسرا مفہوم ہے۔

اِنَّ الْغَنٰی هُوَ الْغَنٰی بِنَفْسِهٖ و لو انہ عاری المناکِبِ حَاب
مَا کُلُّ مَا فَوْقَ السَّیْطِطَةِ کَافِیًا و اذ اقنعت فبعض شیئ کا ب

(ترجمہ) غنی وہی ہے جو دل کا غنی ہو اگرچہ اس کا دوش بے لباس اور پا برہنہ ہوں۔ دوسرے زمین پر جو کچھ بھی ہے اگر سارے کا سارا تجھے مل جائے تو کافی نہ ہو لیکن اگر تو قانع ہو جائے تو معمولی چیز بھی تجھے کفایت کر سکتی ہے۔

ایک نوجوان کا قصہ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تیرہ افراد پر مشتمل ایک یمنی وفد آیا۔ آپؐ اس کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور وفد کے ارکان کی خوب عزت و تکریم کی۔ دورانِ قیام انہوں نے مختلف امور کے متعلق استفسار کیا اور علمِ دین حاصل کرتے رہے۔ یہ لوگ آپؐ کے پاس زیادہ عرصہ نہیں ٹھہرے۔ اُن کی خواہش تھی کہ جلد از جلد واپس جائیں۔ اور اپنے اہل وطن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے آگاہ کریں۔ چنانچہ چند دن ٹھہرنے کے بعد وہ رخصت ہوتے وقت آپؐ کے پاس آئے تو آپؐ نے حضرت بلالؓ کو بھیجا۔ تاکہ انہیں عام و فرد سے بہتر ہدایا و تحائف پیش کریں جب وہ تحائف وصول کر چکے تو آپؐ نے فرمایا: تمہارا کوئی ساتھی محروم نہیں رہا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایک لڑکا ہے جسے ہم اپنے سامان کے پاس بیچے پھوڑائے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اُسے بھی ہمارے پاس بھیج دینا۔ واپس جا کر انہوں نے لڑکے سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور اپنی کوئی حاجت ہے تو پوری کر لو۔ لڑکا آپؐ کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا: یا رسول اللہ میں بنی انبئی کا فرد ہوں اور اُس وفد کے ساتھ یہاں آیا تھا جو ابھی آپؐ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ آپؐ نے اُن کی حاجت تو پوری کر دی ہیں ایک میری حاجت بھی پوری کر دیجیے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: تیری حاجت کیا ہے؟ لڑکا بولا: میری حاجت میرے ساتھیوں جیسی نہیں۔ وہ لوگ آئے تو اسلام کے لیے تھے لیکن دنیا کا مال و متاع لیکر

گئے ہیں۔ میں واللہ صرف اس لیے آیا تھا کہ آپ میرے حق میں اللہ سے یہ دعا کریں کہ وہ میری مغفرت فرمائے مجھ پر رحم کرے اور میرے دل کو غنی بنا دے۔ آپ نے اُسی وقت لڑکے کی طرف رخ پھیرا اور دستِ دعا اٹھا دئے: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ وَاجْعَلْ غَنَاهُ فِيْ قَلْبِهٖ۔ پھر اُس لڑکے کو بھی ویسے ہی تحائف عطا کر کے کا حکم دیا جیسے اُس کے ساتھیوں کو دیئے جا چکے تھے۔ اور اس کے بعد یہ حضرات خوشی خوشی مین روانہ ہو گئے۔

اس واقعہ کو کافی عرصہ بیت گیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر پھر یہی لوگ منیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اپنا تعارف کرایا۔ آنحضرتؐ نے دریافت فرمایا اُس لڑکے کا کیا حال ہے جو تمہارے ساتھ آیا تھا کہنے لگے یا رسول اللہ! اُس جیسا آدمی ہم نے کوئی نہیں دیکھا۔ نہ اُس سے زیادہ قناعت کرنے والا کوئی شخص ہمارے علم میں ہے۔ اگر لوگ ساری دنیا کا مال و دولت بھی آپس میں بانٹ رہے ہوں تو وہ اُن کی طرف بالکل اتنا نہیں کرتا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اِنِّیْ لَا رَجُوْا اَنْ تَمُوْتُ جَمِیْعًا۔ مجھے پوری امید ہے کہ اُس کی موت بھی عالمِ مکیوٹی میں واقع ہوگی۔ اُن میں سے ایک صاحب نے پوچھا: اے اللہ کے رسول کیا ہر شخص یکسوئی کی حالت میں نہیں مرتا؟ آپؐ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: بعض لوگ پراگندگی فکر کے ساتھ مرتے ہیں۔ وہ بسترِ مرگ پر پڑے ہوتے ہیں لیکن اُن کی خواہشات اُن کے افکار، اُن کے پروگرام اور منصوبے نہیں نہ معلوم کہاں کہاں لیے پھرتے ہیں۔ ایسے لوگ جو عالمِ نزع میں بھی یکسو نہیں ہوتے اللہ کو اُن کی کچھ پروا نہیں کہ وہ کس چیز کے غم میں اور کس حالت میں مر رہے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے کہا: مگر وہ نوجوان تو ہمارے درمیان بہترین زندگی بسر کر رہا ہے۔ دنیا کی محبت اس کے دل میں مطلق نہیں اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق پر پوری طرح قانع ہے۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ارتداد کا جو طوفان اٹھا اُس کی رُو میں بہت سے اہلِ مین بھی بہ گئے۔ اس موقع پر یہی نوجوان اپنی قوم کو خدا یاد دلانا رہا اور انہیں اسلام کی حقانیت اور قدر و قیمت بتاتا رہا۔ نتیجہً اس کی قوم کا کوئی فرد مرتد نہ ہوا۔ اس نوجوان کے قصے سے ہمیں کئی سبق ملتے ہیں۔

پہلا سبق تو یہ ہے کہ آدمی کو اُس کے حصہ کا رزق مل کے رہنا ہے۔ اہلِ وفد اُسے نیچے چھوڑ گئے تھے۔ لیکن آپؐ نے انفسار کر کے اسے بلوایا اور تحائف دیئے۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ دولتِ اسلام کے لینے فکر مند شخص دولتِ دنیا سے محروم نہیں رہتا۔ تیسرا سبق یہ ہے کہ اللہ سے رحم و مغفرت اور غنائے نفس کا طلبگار باگاہِ خدا و رسولؐ میں ایک مقامِ خاص کا حقدار بن جاتا ہے جو دوسرے لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ دیکھیے کئی سالوں کے

۴۔ قناعت و رضا سرخسٹہ قوت ہے | بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ غربت و قناعت کی وجہ سے انسان میں صنعت و اضحلال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ معاشرہ میں اپنا مرتبہ و مقام کھو بیٹھتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ خیال قلت فکر کا نتیجہ ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ خنئی خود داری اور عزت نفس اور اپنے موقف پر ٹوٹ جانے کی طاقت قناعت شعار لوگوں میں پائی جاتی ہے اتنی نزاحت کسی بڑے سے بڑے دو تئند اور با اثر آدمی میں بھی موجود نہیں ہوتی نہ تاریخ کے صفحات بھی اسی حقیقت پہ شاہد ہیں کہ ظلم و جور کا مقابلہ کرنے والے، اپنے حقوق کے لیے لڑنے والے اور باجبروت حکمرانوں سے حق و صداقت کی بنیاد پہ ٹکرا جانے والے لوگ بالعموم وہی ہوتے ہیں جنہیں دنیا کمزور اور بے وسیلہ سمجھتی ہے۔ مگر جو تقدیر پہ شاگرد اور مصیبت و ابتلا پہ راضی رہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک قناعت شعار شخص امیروں کے محلات، بادشاہوں کے خزانوں، اور عیش و عشرت میں پینے والے لوگوں کے ساز و سامان کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہے جس طرح کہ بلند فضا میں اڑنے والا پرندہ پستی کی طرف دیکھتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ رفیع اٹھان محلات ریت کے گھر و ندے ہیں، انسان محض چوٹییاں ہیں جو زمین پر رنگ رہی ہیں۔

© rasailojaraid.com

مفتیہ کا آلہ موسیقی توڑ دیا ہے۔ وہ بار بار اپنا ہی سوال دہراتا چلا گیا۔ بوڑھا خلیفہ کی کمزوری سمجھ گیا اور کہنے لگا: جناب آپ کے باپ دادا منبر رسول پر خطبہ جمعہ کے دوران یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاتِّبَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (الحج: ۹۰) اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے سو حضور و الایں نے ایک برائی دیکھی اُسے مٹا دیا۔ اب آپ کو اعتراض کس چیز پر ہے؟ ہارون کو بھی کہنا پڑا کہ اسے تو مٹا ہی دینا چاہیے تھا۔ واقعہ کاراوی کہتا ہے اس کے بعد بوڑھا اٹھا اور نکل گیا۔ ہارون نے اس کے پیچھے ایک آدمی کو دس ہزار درہم کی ایک تھیلی دیکر بھیجا کہ اگر بوڑھا لوگوں سے اس بات کا ذکر نہ کرے تو اسے تھیلی دے دینا بصورت دیگر واپس لے آنا۔ چنانچہ وہ آدمی بوڑھے کے تعاقب میں نکلا تو اسے دیکھا کہ زمین میں دھنسی ہوئی ایک گٹھلی کو نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس نے اُسے تھیلی کی پیش کش کی اور کہا کہ امیر المؤمنین کی طرف سے اسے قبول فرمائیں۔ بوڑھے نے جواب دیا ”خلیفہ سے کہو یہ رقم جہاں سے لی ہے وہیں لوٹا دے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“ اور دوبارہ گٹھلی کے ساتھ مشغول ہو گیا۔ اور یہ اشعار گنگنانے لگا۔

اَرٰى الدُّنْيَا لِمَنْ هِيَ فِي يَدَيْهِ
هُنُومًا كُلَّمَا كَثُوتْ لَدَيْهِ
تَهِيْنُ الْمَكْرَمِيْنَ لَهَا بِصُغْرِ
وَنُكُوْمٌ كُلُّ مَنْ هَانَتْ عَلَيْهِ
اِذَا اسْتَغْنَيْتَ عَنْ شَيْءٍ فَدَعَهُ
وَخُذْ مَا اَنْتَ مُحْتَاجٌ اِلَيْهِ

معلوم ہو کہ قناعت شعار لوگ ہی دراصل طاقتور ہوتے ہیں۔ حق گوئی اور بے باکی سے کام لیتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پورا انجام دے سکتے۔ ان کی عزت نفس اور خودداری انہیں اُمراء و ملوک سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس وجہ سے عامۃ الناس بھی انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ جو رضا و قناعت کے پیکر ہوتے ہیں کبھی کفر و باطل پر سکوت اختیار نہیں کرتے۔ ان میں اتنی جرأت ہوتی ہے کہ بڑے بڑے جابر سلاطین کے سامنے بھی کلمہ حق کہہ سکیں۔

۱۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جس کے ہاتھ میں بہت زیادہ مال و دولت دنیا ہو اُسے کثرتِ نعم و افکار لاحق رہتے ہیں۔ اور جو لوگ دنیا کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں دنیا انہیں ذلیل کرتی ہے اور جو اسے پیچ سمجھتے ہیں یہ انہیں مغر ز ٹھیراتی ہے جب تجھے ایک چیز کی ضرورت نہیں تو اُسے حاصل کرنے کی فکر چھوڑ۔ ہاں جس چیز کی تجھے حاجت ہے اُسے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔